مفتی ساجد احمد صدوی
نگران شعبہ تخصص فی علوم الحدیث، کراچی

اسلام کے نئے ترجمانوں کا طرز و انداز اور فہمِ دین کا صحیح رخ!

ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزوریوں اور غلط فہمیوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا جاتا ہے، وہ باتیں جو کبھی بدیہی اور بحث و تمحیص سے اوپر سمجھی جاتی تھیں، کوئی بھی مسلمان جو دین کے بارے میں بنیادی معلومات رکھتا تھا، وہ اپنے عقیدہ کی پختگی، عمل کی قوت اور قدرے بنیادی معلومات کی روشنی میں یہ بات بخوبی سمجھ لیتا تھا کہ دین میں کس چیز کو بنیاد بنایا گیا ہے؟ کس بات پر زور دیا گیا ہے؟ اسلام کا مزاج کیا ہے؟ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بنیادی، عمومی تقاضے کیا کیا ہو سکتے ہیں؟ مسجد نبوی میں صبح و شام کس بات پر زور دیا جاتا تھا؟ وہ کیا صفات ہیں جس کو اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں؟ وہ کونسی چیزیں ہیں جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے چین کئے ہوتی تھیں؟ کس چیز کا اندیشہ رکھتے تھے؟ کتاب اللہ کی آیتوں اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا واضح، سادہ اور عام فہم تقاضہ، مطالبہ کیا ہو سکتا ہے؟ حضرات صحابہ کی زندگیوں میں کیا نمایاں خصوصیات تھیں؟ یہ سب باتیں اب موضوع بحث بنی ہوئی ہیں، اس لئے نہیں کہ لوگوں کو بتایا جائے: بلکہ اس لئے کہ لوگوں کے دلوں میں، ان کے سینوں میں پہلے سے موجود شعور و وجدان یوں کیوں ہے اور یوں کیوں نہیں؟!

مذکورہ بالا عنوانات جو آج کل بڑے بڑے دانشوروں کا موضوع سمجھے جاتے ہیں، عموماً عام دیندار لوگ ان عنوانات کے تحت گفتگو نہیں کر سکتے؛ مگر عنوان نہ سمجھنا کسی بات کی حقیقت یا شعور و ادراک نہ ہونے کی دلیل نہیں؛ بلکہ ان کی دینی زندگی اور دینی فکر کو قریب سے دیکھنے، سننے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے طبعی انداز میں جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں، کسی کی دینداری یا بے دینی پر رائے دے رہے ہوتے ہیں، دینی حوالے سے کسی بات پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں یا افسردہ ہوتے ہیں، اس میں ان تمام عنوانات کے جوابات خود بخود آجاتے ہیں۔

آج تک دین و شریعت کا متواتر ماحول اور عملی رخ، دینی علوم و تعلیمات جس طرز و طریقہ پر اور جس جس شکل میں ہمارے پاس پہنچی ہیں وہ نہ صرف محفوظ راستے ہیں؛ بلکہ کامل اور مکمل بھی ہیں، ایک عام دیندار بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ یہ دین ہی برحق ہے، اس کی دعوت ساری دنیا کو ہے، یہ پوری دنیا پر، تمام ادیان اور نام نہاد تہذیبوں پر غالب ہونے کے لئے آیا ہے، یہ دین کبھی ان لوگوں کے لئے محبوب اور پسندیدہ نہیں رہا جو اس پر ایمان نہیں رکھتے، ان کا ایمان نہ رکھنا (باوجودیکہ اس کی حقانیت کے اثرات مشاہدہ کر چکے ہوں) ہی اس بغض و عناد اور ضد و ہٹ دھرمی

کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، جوان نافرمانوں کے دلوں میں موجزن ہے، وہ یقین رکھتے تھے کہ دین وشریعت کی خوبی وسربلندی اور ترقی وکامیابی کے لئے اسلام کا واحد ضامن ہونے کے لئے کسی بحث ومباحثہ کی حاجت نہیں، دین وشریعت کو مرغوب بنانے کے لئے کسی کتر وبیونت کی ضرورت نہیں؟

اسلام کی حالت میں جن کے بال سفید ہوگئے ہیں، جن کی عمریں ڈھل رہی ہیں، ان کی باتیں، ان کے جذبات ان کا والہانہ انداز بھی اس بات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ بات کیا ہے؟ بالآخر انسان کو سب سے کٹ کر کس چیز کی تمنا، آرزو رہتی ہے؟ جب شباب کا جنوں اترتا ہے، تو انسان پھر اپنی فطرت کی طرف رجوع کرتا ہے۔

فکرِ اسلامی کے نئے علمبرداروں کا مزاج وانداز:

مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس قدر واضح باتیں بھی اب دھندلائی جارہی ہیں، اب نئی تعبیر وتشریح کے لئے ایسے لوگ فکرمند ہیں جن کی زندگیاں مغرب کی کاسہ لیسی میں گزری ہیں، جن کا دل ودماغ مغربی ہے، اور طرفہ تماشہ یہ کہ ایسے لوگ بھی اب دین کی صحیح تعبیر وتشریح کرتے ہوئے ہچکچاتے نظر آتے ہیں جن کے آباء واجداد حق وباطل کی آویزش میں واضح علامت ہوا کرتے تھے، وہ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ اب ہوٹلوں میں، نئی تہذیب وتمدن کی علامتوں کے مقامات پر اور بڑے بڑے ہالوں کی ڈائسوں پر وہ باتیں نہیں کی جاسکتیں جو سننے والوں کو مرغوب نہ ہوں، جن سے ان کے ماتھے پر شکن آسکتے ہوں، جوان کے ضمیر کو جھنجھوڑ سکتے ہوں۔

ہوٹلوں میں سیمینار، کانفرس منعقد کرانے کو ہی فتح ونصرت سے تعبیر کرنے والے، ٹی وی چینلوں پر معذرت خواہانہ انداز میں رواداری اور حسنِ گفتار وحسنِ سلیقہ کا مظاہرہ کرنے کو کامیابی کی کلید سمجھنے والے، مغربی دنیا اور استعمار زدہ ذہنیت کی حامل تعلیم وتربیت کے نظام کی بیساکھیوں کے بغیر پیغمبرانہ دعوت وتعلیم کو ناتمام اور زمانے کی رفتار سے بے خبر خیال کرنے والے، جھوٹ، فریب، تلبیس، استعماریت کے پرچار اور دھوکہ دہی کی گرم بازاری پر چلنے والے نئے ذرائع اِبلاغ، نام نہاد میڈیا کی توجہ، تعریف کو سند وقابل اعتبار باور کرانے والے، مغرب سے ساز باز کرکے اپنے لئے دنیا میں رہنے کا جواز حاصل کرنے کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت، مادیت کی دوڑ میں شرکت کی خاطر اسلام دشمن طاقتوں کے شانہ بشانہ چلنے کو ترقی کا راستہ سمجھنے والے اور مجبوریوں اور دفع الوقتیوں پر قوم کے مستقبل کی تعمیر کرنے کے خواہشمند دانشوروں کا جو پیغام اسلام اور مسلمانوں کے نام مختلف طور وطریقوں سے سامنے آتا ہے، وہ بزدلی، خوف، احساسِ کمتری، خدا بے زاری، دنیا طلبی، نفس پرستی، سستی، کاہلی، عقیدہ وعمل سے دوری، حقائق سے اغماض، ظاہر پرستی، ابن الوقتی، غیروں کی کاسہ لیسی، مصادرِ شریعت سے لاتعلقی، علوم وفنونِ اسلامیہ کے سرچشموں سے بے خبری، دنیا کی محبت، آخرت سے غفلت، عبادات وریاضات کی بابت بدذوقی اور گوناگوں عیوب واثرات کا حامل ہوتا ہے۔

کسی چیز کی اجازت، جواز ہی کو مطمح نظر بنالینا اور اس کے دوررس اثرات، متوقع نتائج سے آنکھیں

بند کر لینا قائدانہ صلاحیتوں کے خلاف ہوتا ہے، جو لوگ مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں اور مراکز میں آنے سے ہچکچاتے ہوں، یہاں آنے کو اپنی شان سے نیچے تصور کرتے ہوں، ان کو کسی بڑے کردار وعمل پر ابھارا نہیں جاسکتا، ان سے کسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی، ان کا مزاج وانداز دین وشریعت پر یقین رکھنے والوں سے یکسر مختلف ہوگا؛ تاوقتیکہ یہ علم وروحانیت کے مراکز میں حاضری دے کر دین وشریعت کی روح کو سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں، ہاں اگر کسی کی زبانی جمع خرچ وصول کرنے کو ہی ہدف بنایا جائے، تو پھر مسجدوں، خانقاہوں اور دینی مراکز میں کسی کو لانے، بٹھانے کی ضرورت نہیں رہتی، اسکرینوں ہی سے یہ عارضی، وقتی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک دن میں تبدیلی نہیں آسکتی ؛مگر اسلام کا داعی تو اپنے قول وکردار سے اس بات کی ٹوہ میں لگا رہے کہ مغربی تہذیب کے ذرائع، اسکی علامتوں میں، جہاں چند دن کے ذوق کے ساتھ گناہوں کے پروگرام ہوئے اور اب ایک دن کے فرق کے ساتھ دوبارہ ہوں گے ،ایسے ماحول اور کمزور سہاروں کی بنیاد پر اٹھنے والی آوازیں کسی پائیدار دینی انقلاب، تبدیلی اور برکات وثمرات کا سبب نہیں بن سکتیں، جو ہمیشہ قربانی، خون پسینہ بہنے سے ہی حاصل ہوتی رہی ہیں؛ اس لئے جب تک ماحول کو بدلا نہ جائے گا، حقائق، مقاصد اور منزل تک رسائی نہیں ہوگی۔

یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ ہم تک دین جن واسطوں، ذریعوں اور طرز وانداز سے پہنچا ہے، وہ اب بھی استعمال ہوتے ہیں، ان کا دائرہ اثر ختم یا کم نہیں ہوا، ان کی ضرورت بڑھی ہے، ان میں اخلاص ویقین کی جان پیدا کرنے کی ضرورت ہے، یہ طور وطریقے خود بخود رواج پذیر اور اثر انداز نہیں ہوئے ہیں؛ بلکہ اس میں اختراع وایجاد سے زیادہ انتخاب وقبولیت عنداللہ کی روح کارفرما رہی ہے، دفع الوقتی چیزیں، ذرائع وقتی اثر رکھتی ہیں، اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کا، اور انکے چھوڑے ہوئے اثرات کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا، دین کی دعوت، اس کے تقاضے، مطالبے پائیدار اور دیرپا ہوتے ہیں، وہ عوامی رجحانات کی طرح ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلنے اور بدلنے والے نہیں ہوتے۔

مغربی فکر وفلسفہ کی تسبیح پڑھنے والوں کی تعلیم وتربیت کا رخ:

رواداری، ڈائیلاگ، اتحاد امت اور ضروریات زمانہ کے نام پر بے حال ہونے والے لوگوں کی باتوں کا رخ کسی اور طرف کو ہے، وہ عقیدہ وایمان کی پختگی کی علامتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ یقین کے مقابلہ میں شکوک وشبہات اور کردار وعمل کے مقابلہ میں گفتار وپندار کا ذوق رکھتے ہیں، ان کی باتوں میں، ان کے پیغام میں، علم، عمل اور مسائل ومشکلات کے ادراک میں حضرات صحابہ کرام، رضی اللہ عنہم اجمعین، سلف صالحین، اولیاء دین کی طرف پلٹ کر جانے کی دعوت، اس کے لازمی اثرات نہیں پائے جاتے؛ بلکہ اس کے مقابلہ میں وہ نئی تعبیر وتشریح، نئے طور وانداز کے خواہاں ہوتے ہیں، وہ ''روایت پسند'' اور ''غیر روایت پسند'' حلقوں کا عنوان قائم کر کے امت مسلمہ کا رخ مغربی

طرز و انداز کی طرف پھیر دینا چاہتے ہیں، ادنی درجہ کی علمی استعداد اور اعلی درجہ کی شہرت و نسبتوں کی بنیاد پر اجتہاد مطلق کے دروازے پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں؛ بلکہ تقلید، جمود اور مسائل سے آنکھیں بند کر لینے کے خلاف آواز اٹھانے کے نام پر وہ ایک الگ سی دنیا آباد کئے جا رہے ہیں، جس میں جمہور اہلسنت والجماعت اور دین کی تعبیر و تشریح میں اعتماد کا مقام پانے والے ائمہ، مشائخ، اکابر اور علماء کے متبعین کو اس وقت تک داخلہ کی اجازت نہیں مل سکتی، جب تک وہ مغربیت اور جدیدیت کا "بپتسمہ" نہ کروالیں!

اس نئے "فکر غیر اسلامی" کے نقیب لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی مغربی یا مشرقی کافر، مشرک اور منافق ان کی کسی بات پر اپنی پسند کا ظہار کرے تو یہ خوشی سے پھولے سماتے نہیں، ایسا لگ رہا ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالی کی خوشنودی کے بجائے انہی آقاؤں کی خوشنودی، ورضا جوئی میں بے خود و بے حال ہوئے جا رہے ہیں۔

اس واسطے ضرورت پڑی کہ وہ باتیں بیان کی جائیں، جو کبھی عامۃ الناس میں بھی بحث و مباحثہ کی چیز نہیں سمجھی جاتی تھیں، ہر مؤمن خود بخود ان کا ادراک و شعور اپنے وجدان میں محسوس کرتا تھا، نری جہالت کے باوجود علم وحکمت کے دعوے کرنے والے ان باتوں کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہیں، یا ان سے بالکل بے خبر ہیں، ہر بات کو خامخواہ موضوع بحث بنالینا، اس کی کوشش کرنا کہ لوگ عملی کردار کے بجائے نری نظریاتی بحثوں میں الجھے رہیں، مغربی تہذیب دروازوں پر دستک دے، اور یہ ابھی تک یہ طے کرنے میں لگے ہوں کہ ہم نے "گلوبل ویلج" میں کیسے رہنا ہے؟ مغربی آقاؤں کے ساتھ کیسا رویہ، سلوک رکھنا ہے کہ وہ ہمارے "غریب دین" کی تصدیق کر سکیں، ہمیں سرٹیفکیٹ دے سکیں، یہ بحث و مباحثہ میں لوگوں کو الجھانے والے انتشار و خلفشار کو بڑھانے کے نئے راستے تلاش کر رہے ہیں، ان کا پس منظر اور خفیہ مقاصد سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ وساوسِ شیطانی کے زیر اثر کام کرنے والے اس کا بھی جواب سوچنے کی کوشش کریں گے؛ مگر دوسرے لوگ (عام مؤمنین) تو ان کی حقیقت جان لیں گے، یہی مقصد ہے اور بس۔

ذیل میں ایک ایسی شخصیت کی تحریر سے استدلال کیا جا رہا ہے، جس کو دین کی دعوت، اس کا پیغام پہنچانے کے حوالے سے ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے، جس نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحمہم اللہ جمیعا کی صحبتوں، عنایتوں اور توجہات سے اپنے کو صیقل بنایا تھا، جس کا بجا طور پر ان کو اقرار و اعتراف تھا۔ ان بزرگوں کی تربیت اور توجہات کی بدولت مسلم و غیر مسلم دنیا میں اسلام کی دعوت، اس کی صحیح تعبیر و تشریح کرنے کے حوالے سے گوناگوں مواقع نصیب ہو جاتے، نہایت احترام و اکرام کا ماحول ملنے اور شہرت و ناموری کے مقامات سے سرفراز ہونے کے باوجود وہ مغرب زدہ مفکرین کی تعبیر کے مطابق

''روایت پسند'' واقع تھے، ان میں مغربیت، اس کے فکر کی طرف کسی قسم کا جھک جھکاؤ نہیں تھا، بلکہ ایمانی غیرت، عقیدہ کی پختگی اور اپنی روایات واطوار کو جو امت مسلمہ کے تواتر عملی کے ذریعہ پہنچے ہیں مضبوطی سے پکڑے رہنے میں نہ صرف مثالی تھے، اس کے بڑے داعی اور محافظ بھی تھے۔

نئے مفکرین اور دانشوروں کا احساسِ کمتری:

حیرت ہے کہ موجودہ ''ہندوستان'' جیسے تنگ نظر ملک میں رہتے ہوئے وہ پوری قوت کے ساتھ اپنی دعوت کو عام کررہے تھے، دوسری طرف طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اگر کسی کو ایک معمولی درجہ کے سیمینار، کانفرس میں شرکت کا موقع دیا جاتا ہے، یا کسی ادارہ، یونیورسٹی کا دعوت نامہ وصول کرلیتا ہے، کسی مغربی ملک کا ویزہ لگ جاتا ہے تو اس کا لب ولہجہ بدل جاتا ہے، اس کی سوچ فکر کا محور ہی بدل جاتا ہے، پھر وہ بات بات میں اپنے بزرگوں اور ان کی برکتوں، امانتوں کی حامل جماعت، افراد اور ان کے طرز وانداز کو زیرلب طعن وتشنیع کا مورد بناتا رہتا ہے، اس کے اعتراض واشکال کے سارے تیر اپنوں ہی کی طرف رخ کئے ہوئے ہوتے ہیں، ایسے لوگ دوسروں کے لئے صبر وتحمل کا نمونہ بن جاتے ہیں، اور اپنوں کے بارے میں ہمیشہ ''انتہاپسند'' فکر کا مظاہرہ کرتے ہیں، مغربی تہذیب کی علامات، مقامات یا نام نہاد تعلیم گاہوں میں ''ہم خیال'' تسلیم کرکے ''مدعو'' بن جانے کو (جو صریح شکست کی علامت ہے، وہ) بربنائے ضعف، وکمتری اپنی فتح خیال کرنے لگتے ہیں۔

وہ دین کی کسی بھی بات کو جو بالکل بدیہی اور واضح وغیر مبہم تصور ہوتی رہی ہے، صرف اس وجہ سے ''موضوع تماشہ'' بناتے ہیں کہ اس کی زد مغربی تہذیب وتمدن یا اس کے مشرقی رکھوالوں کے طرز وانداز، سوچ فکر پر پڑتی ہے، یا ان کو اس بارے میں اشکال کی تکلیف ہوسکتی ہے، یا یہ بات آج کی ''گلوبل ویلج'' میں ناقابلِ قبول کہلائی جاسکتی ہے، یا کوئی تحریر وتقریر محض اس وجہ سے قابل نفرت ہے کہ اس میں مغربی فکر کی حامل اصطلاحات، تعبیرات کا استعمال نہیں؛ کیونکہ مشرقی نہ ہونے کے باوجود ان بھاری بھرکم اصطلاحات اور تعبیرات کے ''مانوس وآسان'' ہونے کو تسلیم کرلیا گیا ہے، اور مستند ترقی یافتہ لوگ اسی کے عادی اور خواہاں ہیں؛ لہٰذا دین کی تعبیر وتشریح کے ذمہ دار حضرات عوام کو صحیح زبان کی تعلیم وتلقین کا آسان، گوناگوں فوائد اور اثرات کا حامل راستہ اختیار کرنے کے بجائے اپنی زبان اور تعبیر بدلنے پر توجہ دیں، ان مغربی بیساکھیوں کے بغیر ''کوئی'' ان کو قبول نہیں کرے گا۔

مستشرقین نے جو جو اعتراضات، اشکالات ''وحی شیطان'' کی بنا پر تیار کئے تھے، یہ لوگ دوبارہ اسی ''مخفی قوت'' کے بل بوتے پر علمی استدلال، قوت مطالعہ اور بحث ومباحثہ کی روایت، غور وفکر کے نئے گوشوں کے نام ولیبل لگا کر ان کو عام کررہے ہیں، برسوں پہلے ان کی مسترد شدہ مال مصالحے کو، ان کی فرسودہ باتوں، خیالات اور عامیانہ اشکالات کو زبان وبیان کی پالش لگا کر دادِ تحقیق ومطالعہ وصول کررہے ہیں، اور یوں پوری دینی فضا کو مسموم بنانے پر تلے

ہوئے ہیں۔

دین (اسلام) کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات:

حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۴۰۲ھ، شوال کے پہلے ہفتہ میں (مطابق ۲۷، جولائی تا ۳ اگست ۱۹۸۲ء) الجزائر کے تاریخی شہر "تلمسان" میں منعقد ہونے والی "سولویں فکر اسلامی کانفرس" میں پیش کرنے کے لئے جو مقالہ لکھا تھا، اس میں انہوں نے دین کے مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات، خدوخال کے حوالے سے گفتگو کی تھی، جو نہایت قیمتی تجزیہ پر مشتمل تھا، یہ مقالہ بعد میں ان کی کتاب "العقیدۃ والعبادۃ والسلوک" کا حصہ بنا، جس کا اردو ترجمہ "دستور حیات" کے نام سے حضرت مولانا سید سلمان صاحب ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے لکھنو اور کراچی سے شائع ہوتا رہا، اسی مقالہ میں مذکور موضوعات کو نئے عنوانات لگا کر "دستور حیات" سے ایک اقتباس شامل کیا ہے، جو خصوصیات ہی سے متعلق ہے، یہ تلخیص کسی ترمیم کے بغیر ترجمان کی زبان میں پیش کی جارہی ہے (بریکٹ بھی تقریباً ترجمہ ہی سے ماخوذ ہیں) ؛ تاکہ ان لوگوں کے فکر وفلسفہ کا بروقت جائزہ لینے میں مدد فراہم کی جاسکے جو اس وقت اتحاد امت، ضروریات زمانہ، تہذیبوں کا تصادم، گلوبل ویلج، مغرب سے یا ان کے ہم وطنی، مشرقی خوشہ چینوں سے استفادہ، ان سے دین وشریعت کے لئے تصدیق وسرٹیفکیٹ لینے، داد ودہش پانے اور ساز باز کرلینے جیسے مقاصد وعنوانات کے تحت مختلف شکلوں اور صورتوں میں جابجا نمودار ہوتے نظر آتے ہیں۔

دین پہنچانے والوں کا حقیقی تعارف:

اس کائنات میں ہر زندہ اور متحرک شی کا ایک خاص مزاج، کچھ نمایاں خصوصیات، اور ابھرے ہوئے خط وخال ہوتے ہیں، جن سے اس کی "شخصیت" کی تشکیل اور اس کا تعین ہوتا ہے، اور وہ اس کی صفات ممیزہ قرار پاتی ہیں، اس میں افراد، جماعتیں، ملتیں اور قومیں، مذاہب اور فلسفے یکساں طور پر شریک ہیں، وہ سب اپنی کچھ امتیازی خصوصیات اور نمایاں علامات رکھتے ہیں... سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ یہ دین ہم تک حکیموں اور دانش وروں، ماہرینِ قانون، علمائے اخلاق ونفسیات، کشور کشا اور قانون ساز، بانیانِ سلطنت، خیالی گھوڑے دوڑانے والے فلاسفہ اور طالع آزما سیاسی رہنماؤں اور ملکوں اور قوموں کے قائدین کے ذریعہ نہیں پہونچا، یہ دین ہم تک ان انبیائے کرام کے ذریعہ پہونچا ہے جن کے پاس خدائے تعالیٰ کی وحی آتی تھی، اور جن کا سلسلہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ختم ہو چکا ہے۔

عقیدہ کی درستگی وپختگی کو بنیادی حیثیت کے طور پر مدنظر رکھنا:

اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار "عقیدہ" پر زور اور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل

کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام ایک معین عقیدے کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت، یا دست ے پر تیار نہ ہوئے، ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار کا حامل، نیکی وصلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسمہ خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود اور کسی مفید انقلاب کا ظہور رہا ہو، اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو جس کو وہ لے کر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔

جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں، یہی وہ حد فاصل اور واضح و روشن خط ہے، جو انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی دعوت اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے درمیان کھینچ دیا گیا ہے، جس کا سرچشمہ فکر و نظر انبیائے کرام کی تعلیمات اور سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔

موجودہ دور کے بگڑے ہوئے حالات سے دل برداشتہ بہت سے لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص کے جو انقلاب کا نعرہ لگائے یا کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرے ہر بگاڑ، اور افکار و نظریات کی ہر کجی اور انحراف کو معاف کر دیتے ہیں، اور عقیدہ کے مسئلہ سے بالکل صرف نظر کر لیتے ہیں؛ بلکہ الٹے ان لوگوں کو ہدف ملامت بنا لیتے ہیں اور کبھی باطل طاقتوں سے ساز باز کر لینے کا الزام بھی لگاتے ہیں جو اس موقعہ پر عقیدہ کی بحث کو اٹھائیں، اور اس شخص کے عقائد کے بارے میں کوئی سوال کریں؛ یہ طرز فکر اور طرز عمل صحیح دینی مزاج اور نبوی طریق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

رضائے الٰہی کو مقصود و مطلوب کے طور پر پیش نظر رکھنا:

دوسری بات یہ کہ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی (جن میں سرفہرست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے) دعوت و تبلیغ اور جہد و جہاد کا حقیقی محرک اور سبب محض خدائے تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی طلب ہوتی ہے، یہ ایک ایسی تیز تلوار ہے، جو اس مقصد اعلیٰ کے علاوہ ہر مقصد کو کاٹتی اور نیست و نابود کر دیتی ہے، پھر نہ متاع دنیا کی طلب رہتی ہے، اور نہ ملک و دولت، اور سلطنت و ریاست کی چاہت، نہ سربلندی اور عزت کی خواہش، نہ غلبہ و اقتدار کی ہوس، نہ مال و منال اور عیش و تنعم کی تمنا، نہ غضب و انتقام کا جذبہ، نہ جاہلی حمیت کا جوش، ان میں سے کوئی چیز بھی ان کو جد و جہد اور جہاد پر نہیں ابھارتی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قوت و طاقت جس کے ذریعہ مسلمان احکام خداوندی کا نفاذ کر سکتا ہے، اور دعوت کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو ہٹا سکتا ہے، اور جس کے ذریعہ زمین میں فساد اور ظلم اور باطل کے غلبہ کی آگ بجھا سکتا ہے، مثالی اسلامی زندگی، اور شریف و متدین ایمانی معاشرہ کے لئے سازگار ماحول تیار کر سکتا ہے،

حقیقت یہی ہے کہ انبیاء کرام پوری انسانیت کے لئے اسوۂ کامل، اعلیٰ قابل تقلید نمونہ اور اخلاق، ذوق

در جحان، رد وقبول اور وصل وفصل کے بارے میں سب سے مکمل اور آخری معیار ہوتے ہیں، وہ مورد عنایات الٰہی اور مرکز الطاف وتجلیات ہوتے ہیں، ان کے اخلاق وعادات، اور ان کی زندگی کا طور وطریق سب خدا کی نظر میں محبوب ہیں، زندگی کے طریقوں میں ان کا طریق حیات، انسانوں اور جماعتوں کے اخلاق میں ان کے اخلاق، اور لوگوں کی گوناگوں عادتوں میں ان کی عادتیں؛ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بن جاتی ہیں۔

انبیاء جس راستہ کو اختیار کرتے ہیں، وہ راستہ خدا کے یہاں محبوب بن جاتا ہے، اور اس کو دوسرے راستوں پر ترجیح حاصل ہوتی ہے، صرف اس وجہ سے کہ انبیاء کے قدم اس راستہ پر پڑے ہیں، ان کی تمام پسندیدہ چیزوں اور شعائر اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء اور اعمال سے اللہ کی محبت اور پسندیدگی متعلق ہو جاتی ہے، ان کا اختیار کرنا، اور ان کے اخلاق کی ایک جھلک پیدا کرنا، اللہ کی محبت و رضا سے سرفراز ہونے کا قریب ترین اور سہل ترین راستہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ دوست کا دوست دوست اور دشمن کا دوست دشمن سمجھا جاتا ہے... اسکے برعکس جو ظلم پر کمر باندھے ہوئے اور کفر کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ان کی طرف دل کا میلان، ان کے طریق حیات کی ترجیح اور ان سے صوری ومعنوی مشابہت، اللہ کی غیرت کو حرکت میں لانے والی، اور اللہ سے بندے کو دور کرنے والی بتائی گئی ہے۔

ان پیغمبرانہ مخصوص عادات واطوار کا نام شریعت کی زبان اور اصطلاح میں ''خصال فطرت'' اور ''سنن الہدیٰ'' ہے، جس کی شریعت تعلیم وترغیب دیتی ہے، ان اخلاق وعادات کا اختیار کرنا لوگوں کو انبیاء کے رنگ میں رنگ دیتا ہے، اور یہ وہ رنگ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''(کہدو کہ ہم نے) خدا کا رنگ (اختیار کرلیا) اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے، اور ہم اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔'' (سورۂ بقرۃ، ۱۳۸)

ایک عادت کی دوسری عادت، ایک اخلاق کے دوسرے اخلاق، ایک طور طریق کے دوسرے طور وطریق پر دین وشریعت میں ترجیح کا یہی راز ہے، اسی وجہ سے اس کو شریعت اسلامی اہل ایمان کا شعار، فطرت کے تقاضہ کی تکمیل اور اس کے خلاف طریقوں کو فطرت سلیم سے انحراف، اور اہل جاہلیت کا شعار قرار دیتی ہے، اور ان دونوں طریقوں اور راستوں میں (باوجود اس کے کہ اس طرف بھی عقل وخرد رکھنے والے متمدن انسان ہیں، اور اس طرف بھی) محض اس بات کا فرق ہے کہ ایک خدا کے پیغمبروں اور اس کے محبوب بندوں کا اختیار کیا ہوا ہے، دوسرا ان لوگوں اور قوموں کا جن کے پاس ہدایت کی روشنی اور آسمانی تعلیمات نہیں ہیں، اس اصول کے تحت کھانے پینے، کاموں میں دائیں بائیں ہاتھ کا فرق، لباس وزینت، رہنے سہنے اور تمدن کے بہت سے اصول آجاتے ہیں، اور یہ سنت نبوی اور فقہ اسلامی کا ایک وسیع باب ہے۔

محبت وعشق رسول کی تعلیم:

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے، وہاں اس پہلو پر اور زیادہ زور دینے اور اس

کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، آپ کی ذات کے ساتھ صرف ضابطہ اور قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی اور جذباتی تعلق اور ایسی گہری اور دائمی محبت مطلوب ہے، جو جان و مال، اہل وعیال کی محبت پر فوقیت لے جائے۔

اس سلسلہ میں ان تمام مخالف اسباب ومحرکات سے محفوظ ومحتاط رہنے کی ضرورت ہے، جو اس محبت کے سوتوں کو خشک یا اس کو کمزور کرتے ہیں، جذبات واحساسات محبت میں افسردگی، سنت پر عمل کرنے کے جذبہ میں کمزوری اور آپ کو "دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل" سمجھنے میں تردد، اور سیرت وحدیث کے مطالعہ سے روگردانی اور بے توجہی کا سبب بنتے ہیں، سورۂ احزاب، سورۂ حجرات اور سورۂ فتح وغیرہ قرآنی سورتوں کے غائر مطالعہ اور تشہد ونماز جنازہ میں درود وصلوۃ کی شمولیت پر غور وفکر، قرآن میں درود کی ترغیب اور درود کی فضیلت میں بکثرت وارد ہونے والی احادیث کا راز سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ایک مسلمان سے اس سے کچھ زیادہ مطلوب ہے، جس کو صرف قانونی اور ضابطہ کا تعلق کہا جاتا ہے، اور جو محض ظاہری اطاعت سے پورا ہو جاتا ہے؛ بلکہ وہ پاس وادب، محبت اور تشکر وامتنان کا جذبہ بھی مطلوب ہے، جس کے سرچشمے دل کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہوں، اور جو رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہو، اسی پر محبت احترام اور احترام آمیز محبت کو قرآن نے "تعزیر" و "توقیر" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

اس عشق رسول سے ان علمائے راسخین، مصلحین ومجددین، زعماء وقائدین کو بہرۂ وافر ملا، جنہوں نے دین کی حقیقی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا، اور جن کے مقدر میں دین وملت کے احیاء وتجدید کا اہم کارنامہ انجام دینا تھا۔

اس پاک محبت کے بغیر جو شرعی احکام وآداب کے تابع واسوۂ صحابہ کے اتباع وتقلید کے ساتھ ہو؛ اسوۂ رسول کی کامل پیروی واتباع، جادۂ شریعت پر استواری، نفس کا دیانت دارانہ محاسبہ، اور "عسر ویسر" اور طبیعت کی آمادگی وگرانی (منشط ومکرہ) میں خدا اور رسول کی فرمانبرداری ممکن نہیں؛ یہی (کثیر النوع) نفسیاتی امراض کا علاج، تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کا مؤثر ذریعہ ہے، محبت کی ایک لہر خس وخاشاک کو بہالے جاتی اور رگ وریشہ اور جسم وجان میں اس طرح دوڑ جاتی، اور جذب ہو جاتی ہے۔ ع   شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم

مسلمان جو کبھی خدا اور رسول کے عشق کی بدولت شعلۂ جوالہ تھے، اس کے بغیر چوب خشک اور سرد خاکستر بنے ہوئے ہیں۔

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے   مسلماں نہیں، خاک کا ڈھیر ہے

دین وشریعت کی عالمگیر یکسانیت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد ائمہ وفقہائے اسلام اور اپنے اپنے وقت کے مجددین ومصلحین اور علمائے ربانی نے ہمیشہ اپنے اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی، اور اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول ورواج پذیر ہونے سے روکنے کی جان توڑ کوشش کی، ان بدعات میں عوام اور خوش عقیدہ لوگوں کے

لئے جو مقناطیسی کشش ہر زمانہ میں رہی ہے، اور ان سے پیشہ ور، دنیا دار مذہبی گروہوں اور افراد کے جو ذاتی مفادات وابستہ رہے ہیں، جن کی تصویر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس معجزانہ آیت میں کھینچی ہے۔

''اے ایمان والو! اکثر احبار و رہبان لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں''۔ (سورۃ التوبہ، ۳۴)

اس کی بنا پر ان کو سخت مخالفتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا؛ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی، اور اس کو اپنے وقت کا جہاد اور شریعت کی حفاظت کا اور دین کو تحریف سے بچانے کا مقدس کام سمجھا، ان مخالفین بدعت اور حاملین لواءِ سنت کو اپنے زمانہ کے عوام، یا خواص کالعوام سے ''جامد''، ''روایت پرست''، ''مذہب دشمن'' وغیرہ کے خطابات ملے؛ لیکن انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی، ان کے اس لسانی اور قلمی جہاد، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل سے بہت سی بدعات کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ ان کا معاشرہ وتمدن کی بعض تاریخوں میں ذکر رہ گیا ہے، اور جو باقی ہیں ان کے خلاف علمائے حقانی اب بھی صف آراء ہیں۔ (اقتباس دہم از دستور حیات، ص:۸۶، تا ص:۸۸)

دین کیلئے موسم و ماحول کی اہمیت:

آخری بات یہ ہے کہ اسلام کو ایک معاون فضاء؛ بلکہ زیادہ واضح اور محتاط الفاظ میں ایک مناسب موسم اور متعین درجہ حرارت و برودت کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ ایک زندہ انسانی دین ہے، وہ کوئی عقلی اور نظریاتی فلسفہ نہیں، جو صرف دماغ کے کسی خانہ یا کتب خانہ کے کسی گوشہ میں موجود و محفوظ ہو، وہ بیک وقت عقیدہ و عمل، سیرت و اخلاق، جذبات و احساسات اور ذوق کے مجموعہ کا نام ہے، وہ انسان کو نئے سانچہ میں ڈھالتا، اور زندگی کو نئے رنگ میں رنگتا ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو ''صبغۃ اللہ'' کی صفت سے یاد فرماتا ہے، صبغہ ایک رنگ، امتیازی شان اور نمایاں چھاپ ہے، اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ حساس واقع ہوا ہے، اس کے متعین و معروف حدود ہیں، جن سے کوئی مسلمان تجاوز نہیں کرسکتا، کسی دوسرے مذہب میں ''ارتداد'' کا نہ وہ واضح مفہوم پایا جاتا ہے، نہ اس کی وہ شناعت اور قباحت ہے، جو اسلامی شریعت اور اسلامی تصور میں پائی جاتی ہے۔

دینی حرارت کا ماحول قائم کرنے کا راستہ و طریقہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور ارشادات و ہدایات آپ کا اسوۂ مبارکہ و سنت (عقائد، و عبادات سے لے کر اخلاق و معاملات، اور احساسات و جذبات تک) دین کے لئے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں، جس میں دین کا پودہ سرسبز اور بارآور ہوتا ہے، کیونکہ دین زندگی کے تمام شرائط و صفات (نمو و حرکت، اہتزاز و فرحت، نفرت و کراہیت، احساس برتری و فخر) کا مجموعہ ہے، اسلئے وہ پیغمبر کے جذبات و احساسات اور اسکی

زندگی کے واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اور اسکا بہترین مجموعہ احادیث صحیحہ، اور محفوظ و مدون سنت نبوی ہے، دین ایک مثالی اور معیاری ماحول کی نظیر کے بغیر زندہ و شاداب نہیں رہ سکتا، اور یہ ماحول حدیث نبوی کے ذریعہ محفوظ ہے، اسلئے اللہ تعالی نے قرآن حکیم کی حفاظت کیساتھ ساتھ حامل قرآن کے صحیفہ حیات کی بھی حفاظت فرمائی، اسی کی بدولت حیات طیبہ کی فیض رسانی اور حیات بخشی کا امتداد و تسلسل اس وقت تک باقی ہے، اسی کے نتیجہ میں علماء امت "معروف" و "منکر"، "سنت" و "بدعت" اور "اسلام" و "جاہلیت" میں ہر دور میں فرق کرنے کے قابل ہوئے، اور ان کے پاس وہ بیرومیٹر (ہوا کا دباؤ ناپنے کا آلہ) رہا، جس سے وہ اپنے دور کے مسلمان معاشرہ کے اصل اسلامی عقیدہ وعمل سے حد وانحراف کی پیمائش کرتے رہے، وہ امت کے دینی محاسبہ کا عمل جاری اور اصل دین کی دعوت کے فریضہ کو ہر دور میں قائم اور باقی رکھ سکے۔

سنت وحدیث کے یہ مجموعے (جن میں صحاح ستہ ممتاز ومعروف ہیں) اور ان کے درس و تدریس، نشر واشاعت کی مشغولیت اور مواقع ہمیشہ اصلاح وتجدید اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں، انہیں کی مدد سے اصلاح کا بیڑہ اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں شرک وبدعت اور رسوم جاہلیت کی تردید ومخالفت اور سنت کی اشاعت وترویج کا جھنڈا بلند کیا، اسی ذخیرہ نے علمائے دین اور اہل شعور کو شر وفساد اور بدعات وضلالت کی طاقتوں اور تحریکوں سے پنجہ آزمائی کرنے، اور ان کے مقابلہ میں کفن بردوش ہو کر صف آراء ہو جانے پر آمادہ کیا، اور تاریخ کی شہادت ہے کہ اس امت میں اصلاح وتجدید کی تاریخ علم حدیث سے واقفیت واشتغال اور سنت کی محبت وحمایت سے وابستہ ومربوط ہے، جب بھی حدیث وسنت کی کتابوں سے علمی حلقوں کے تعلق و واقفیت میں کمی آئی، اور دوسرے علوم وفنون میں ان کا انہماک بڑھا، مسلم معاشرہ اہل اصلاح واہل کمال کی موجودگی میں نئی نئی بدعات، جاہلی وعجمی رسم ورواج، غیر مسلموں کے اختلاط، اور مذاہب غیر کے اثرات کا شکار ہوگیا، اور کبھی کبھی یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا، کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا ایڈیشن اور اس کا مکمل عکس نہ بن جائے۔

دین کے خاص مزاج وخصوصیات سے واقفیت کی اہمیت وضرورت:

یہ ہے دین کا وہ خاص مزاج، اور اس کے امتیازی صفات اور نمایاں خط وخال جن سے دین کی اُس شخصیت کی نمود اور بقاء ہے، جو اس کو دوسرے مذاہب اور فلسفوں سے ممتاز کرتی ہے، ایک مسلمان کو اس سے واقف بھی ہونا چاہئے، اور اس کے بارے میں اس کے اندر شدید غیرت وحمیت بھی پائی جانی چاہئے، اسی کے ذریعہ ہم ہر دور میں حق وباطل کی آویزش نیز آمیزش میں (جو بعض اوقات آویزش سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے) دین صحیح کی صراط مستقیم پر قائم بھی رہ سکتے ہیں، اور اس کی خدمت وحفاظت کی سعادت وتوفیق بھی حاصل کرسکتے ہیں۔